ALLAMA IQBAL OPEN UNIVERSITY

AIOU LIBRARY
aioulibrary.com

Name:

Registration No.:

Course Code: 2954

Program: BS Islamic Studies (Islamic Law & Jurisprudence)

Semester: Autumn 2026

علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد

(کلیہ عربی وعلوم اسلامیہ) — (شعبہ شریعہ)

کورس: اسلام کا بین الاقوامی قانون (2954) • سطح: بی ایس علوم اسلامیہ (اسلامک لاء اینڈ جیورس پروڈنس)

سمسٹر: خزاں 2026

امتحانی مشق نمبر 1 (بونس: 1 تا 5)

کل نمبر: 100 • کامیابی کے نمبر: 50

حل شدہ اسائنمنٹ گائیڈ

Reference &For Study — SOLVED ASSIGNMENT GUIDE

نوٹ: یہ گائیڈ صرف مطالعہ اور حوالے کے مقصد کے لیے تیار کی گئی ہے۔ طلبہ کو مشورہ دیا جاتا ہے کہ وہ کورس کی کتاب کے متعلقہ یونٹس غور سے پڑھیں، تصورات کو اچھی طرح سمجھیں اور پھر اسائنمنٹ اپنے الفاظ میں لکھیں۔ اس گائیڈ کو ہو بہو نقل کرنے کے بجائے اپنی فہم کے مطابق تحریر کریں۔ جہاں کسی دینی یا قانونی مسئلے میں قطعی رائے درکار ہو وہاں اہلِ علم اور مستند علماء کی طرف رجوع کریں۔

سوال نمبر 1: دنیا کی دو داروں میں تقسیم اور فقہاء کی آراء کا تجزیہ (20 نمبر)

سوال نمبر 1: دنیا کی دو داروں میں تقسیم پر مختلف فقہاء کی آراء کا تجزیہ پیش کریں۔ (20)

تعارف

اسلامی بین الاقوامی قانون، جسے فقہ کی اصطلاح میں علم السیر یا فقہ السیر کہا جاتا ہے، کا ایک بنیادی اور ابتدائی مسئلہ دنیا کی علاقائی تقسیم ہے۔ قدیم فقہاء نے ریاستوں اور خطوں کے باہمی تعلقات کو سمجھنے اور ان پر شرعی احکام کا اطلاق کرنے کے لیے دنیا کو مختلف داروں یعنی علاقائی و قانونی اکائیوں میں تقسیم کیا۔ اس تقسیم کی مشہور صورت دنیا کا دار الاسلام اور دار الحرب میں منقسم ہونا ہے، اور بعض فقہاء نے ایک تیسرے دار یعنی دار العہد یا دار الصلح کا اضافہ بھی کیا ہے۔ یہ تقسیم قرآن و سنت میں صراحت کے ساتھ مذکور نہیں، بلکہ یہ فقہاء کا اجتہادی فہم ہے جو انہوں نے اپنے عہد کے سیاسی حالات، اسلامی ریاست کے پھیلاؤ اور غیر مسلم اقوام کے ساتھ تعلقات کے تجربے کی روشنی میں وضع کیا۔ اسی لیے اس تقسیم کی بنیاد، شرائط اور نتائج میں فقہاء کے درمیان قابل لحاظ اختلاف پایا جاتا ہے۔ اس جواب میں پہلے دار کی لغوی و اصطلاحی تعریف اور اس تقسیم کا تاریخی پس منظر بیان کیا جائے گا، پھر امام ابو حنیفہ، صاحبین، امام شافعی، امام مالک اور دیگر فقہاء کی آراء کا جائزہ لیا جائے گا، دار العہد کی بحث پیش کی جائے گی اور آخر میں ان آراء کا تجزیہ اور عصر حاضر کے بین الاقوامی نظام کی روشنی میں ان کی معنویت پر گفتگو ہو گی۔

دار کا مفہوم اور تقسیم کا تاریخی پس منظر

دار کے لغوی معنی گھر، مسکن اور خطہ ارضی کے ہیں، اور اصطلاح فقہ میں دار سے مراد وہ علاقہ یا ملک ہے جو ایک خاص قانونی و سیاسی حیثیت رکھتا ہو اور جہاں کسی مخصوص نظام قانون کی عمل داری ہو۔ دار الاسلام سے مراد وہ خطہ ہے جہاں اسلامی احکام نافذ ہوں اور مسلمان اور ذمی امن کے ساتھ رہتے ہوں، جبکہ دار الحرب سے مراد قدیم فقہی ادب میں وہ خطہ تھا جہاں نہ اسلامی احکام نافذ ہوں اور نہ مسلمانوں کے ساتھ صلح و امن کا معاہدہ ہو۔ اس تقسیم کا تاریخی پس منظر یہ ہے کہ ابتدائی صدیوں میں مسلمانوں اور ارد گرد کی سلطنتوں کے درمیان تعلقات زیادہ تر جنگ و صلح کی دو حالتوں میں سے کسی ایک میں ہوتے تھے؛ مستقل سفارت، عالمی تنظیمیں اور باہمی معاہدات کا وہ جال موجود نہ تھا جو آج کے دور میں ہے۔ فقہائے سیر، خصوصاً امام محمد بن حسن شیبانی نے اپنی کتاب السیر الکبیر میں اسی ماحول میں رہتے ہوئے دارین کی تقسیم کی بنیاد پر سرحدوں، امن، تجارتی آمد و

رفت، سفیروں اور جنگ و صلح کے احکام مرتب کیے۔ لہٰذا اس تقسیم کو اس کے تاریخی سیاق میں سمجھنا ضروری ہے؛ اسے جغرافیائی نفرت یا مستقل دشمنی کا عقیدہ سمجھنا درست نہیں، بلکہ یہ اپنے دور کی سیاسی حقیقت کی قانونی درجہ بندی تھی جس کا اصل مقصد تعلقات کو قانون کے دائرے میں لانا تھا۔

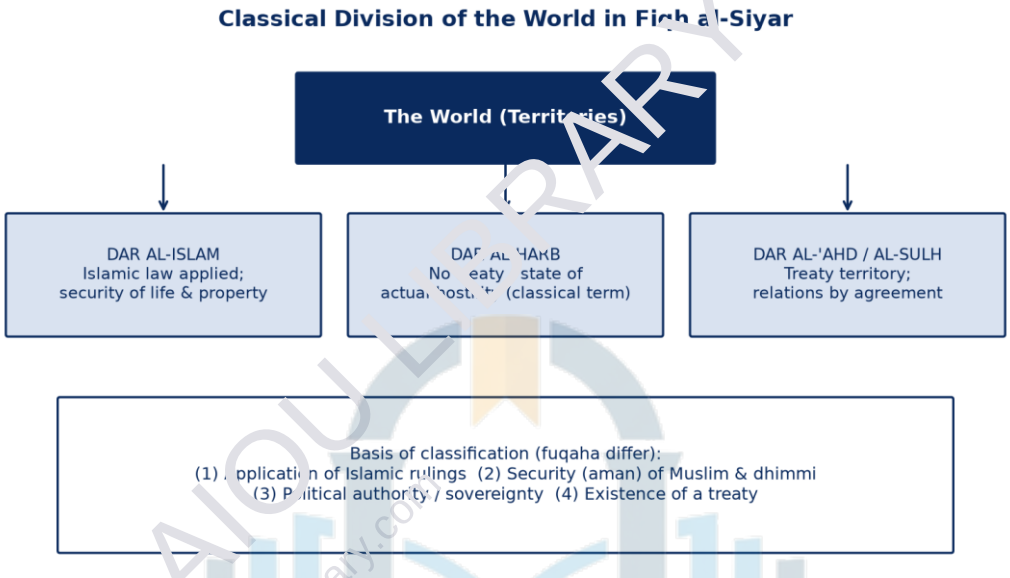

تصویر 1: فقہ السیر میں دنیا کی کلاسیکی تقسیم: دار الاسلام، دار الحرب اور دار العہد۔

امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کی رائے: تین شرائط

امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے مسلک میں دار الاسلام اور دار الحرب کا تعین بنیادی طور پر دو اصولوں سے ہوتا ہے: اسلامی احکام کا ظہور و نفاذ اور مسلمان و ذمی کا امن۔ حنفی فقہاء کے ہاں جو علاقہ دار الاسلام بن جائے وہ تین شرائط کے بیک وقت پائے جانے کے بغیر دار الحرب نہیں بنتا: پہلی شرط یہ کہ وہاں کفر کے احکام کھلے عام جاری ہو جائیں اور شرعی احکام کا نفاذ ختم ہو جائے؛ دوسری یہ کہ وہ علاقہ دار الحرب سے اس طرح مل جائے کہ درمیان میں کوئی دار الاسلام حائل نہ رہے؛ اور تیسری یہ کہ وہاں کوئی مسلمان یا ذمی اپنے پہلے امن یعنی اسلام یا عقد ذمہ کے امن کے ساتھ باقی نہ رہے۔ ان تینوں شرائط کا اجتماع اس قدر سخت رکھا گیا کہ عملی طور پر کسی آباد مسلم علاقے کا درجہ آسانی سے تبدیل نہیں ہوتا۔ اس کے برعکس کسی غیر مسلم علاقے کے دار الاسلام بننے کے لیے حنفیہ کے ہاں صرف اسلامی احکام کا نفاذ کافی سمجھا گیا۔ اس رائے کی حکمت یہ ہے کہ دار کی تبدیلی کے

نتیجے میں ہزاروں انسانوں کی جان، مال اور قانونی حیثیت متاثر ہوتی ہے، اس لیے قانون میں استقرار اور احتیاط کو مقدم رکھا گیا۔ حنفی موقف کی یہی احتیاط بعد میں برصغیر سمیت متعدد خطوں کے بارے میں ہونے والی فقہی مباحث میں مرکزی حیثیت اختیار کر گئی۔

صاحبین اور امام شافعی رحمہ اللہ کی آراء

امام ابو یوسف اور امام محمد رحمہما اللہ یعنی صاحبین کے نزدیک دار الاسلام کے دار الحرب بننے کے لیے صرف ایک شرط کافی ہے: وہاں کفر کے احکام کا ظہور و غلبہ۔ ان کے ہاں اصل معیار احکام کا نفاذ ہے؛ جس علاقے میں اسلامی شریعت کے احکام نافذ نہ رہیں اور غیر اسلامی قانون غالب آ جائے وہ دار الحرب کے حکم میں آ جائے گا۔ یہ رائے ظاہری طور پر امام ابو حنیفہ کی رائے سے مختلف ہے مگر دونوں کا محور ایک ہی ہے یعنی قانون کی عمل داری، فرق صرف درکار شرائط کی تعداد اور سختی میں ہے۔ امام شافعی رحمہ اللہ کے ہاں بھی اصل مدار احکام اسلام کے نفاذ اور مسلمانوں کے امن پر ہے؛ شافعی فقہاء کے نزدیک جو علاقہ ایک بار دار الاسلام بن جائے اس کی یہ حیثیت بڑی مضبوط سمجھی جاتی ہے اور اس کے بارے میں احکام اسی حیثیت کو سامنے رکھ کر بیان کیے گئے ہیں۔ شافعی فقہ میں دار العہد کا تصور بھی نمایاں طور پر موجود ہے، یعنی وہ علاقہ جس کے باشندوں نے اپنی زمین اپنے پاس رہنے دیتے ہوئے مسلمانوں سے صلح کر لی ہو؛ ایسے علاقے کو نہ مکمل دار الاسلام کہا جاتا ہے نہ دار الحرب، بلکہ معاہدہ اس کے قانونی مرتبے کا تعین کرتا ہے۔ یہ تیسری قسم دراصل اس بات کا ثبوت ہے کہ فقہی تقسیم جامد دو خانوں تک محدود نہ تھی بلکہ معاہدات کے ذریعے نئی قانونی صورتیں پیدا ہو سکتی تھیں۔

امام مالک، امام احمد اور دیگر فقہاء کی آراء

مالکی اور حنبلی فقہاء کی آراء میں بھی بنیادی زور اسی بات پر ہے کہ دار کی پہچان اسلامی احکام کے غلبے، شعائرِ اسلام کے اظہار اور مسلمانوں کی سلامتی سے ہوتی ہے۔ مالکی فقہ میں ہجرت، امن اور اسلامی حکومت کی عمل داری کے مباحث اسی تناظر میں بیان ہوئے ہیں۔ امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے ایک نہایت اہم نکتہ پیش کیا جسے دار مرکب یا دار مختلط کی بحث کہا جاتا ہے۔ ان سے ایک ایسے شہر کے بارے میں پوچھا گیا جہاں مسلم اور غیر مسلم دونوں بستے ہوں اور احکام کا نفاذ مخلوط ہو؛ ان کا جواب تھا کہ ایسا علاقہ تیسرے قسم کا ہے، نہ مکمل دار الاسلام ہے کہ اس پر اس کے احکام لگیں اور نہ مکمل دار الحرب، بلکہ وہاں ہر شخص کے ساتھ اس کے استحقاق کے مطابق معاملہ کیا جائے گا: مسلمان کے ساتھ

اس کے اسلام کے مطابق اور سرکشی و جارحیت کرنے والے کے ساتھ اس کے عمل کے مطابق۔ یہ رائے اس بات کی گواہ ہے کہ خود کلاسیکی فقہاء کے ہاں بھی یہ تقسیم حالات کے تنوع کے سامنے لچک رکھتی تھی اور سیاہ و سفید دو خانوں میں دنیا کو بانٹنا مقصود نہ تھا۔ اسی طرح بعض فقہاء نے دار البغی، دار الامان اور دار الموادعہ جیسی ذیلی اقسام بھی ذکر کیں جو اصل تقسیم کی عملی تفصیلات ہیں۔

جدول 1: دارین کی تقسیم میں فقہاء کی آراء کا خلاصہ

دار الحرب بننے کی شرط	دار الاسلام کی پہچان	رائے / امام
تین شرائط بیک وقت: کفر کے احکام کا نفاذ، دار الحرب سے اتصال، سابقہ امن کا خاتمہ	احکام اسلام کا نفاذ اور مسلم و ذمی کا امن	امام ابو حنیفہ
صرف کفر کے احکام کا ظہور و غلبہ کافی ہے	احکام اسلام کا نفاذ	صاحبین (ابو یوسف و محمد)
اسلامی حیثیت مضبوط رہتی ہے؛ دار العہد مستقل تیسری قسم	احکام اسلام کا نفاذ اور امن	امام شافعی
دار مرکب: ہر فریق سے اس کے استحقاق کے مطابق معاملہ	حالات کی مخلوط صورت کا اعتراف	امام ابن تیمیہ

آراء کا تجزیہ: بنیادوں کا اختلاف

ان تمام آراء کا بغور تجزیہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ فقہاء کا اختلاف لفظی یا مقصدی نہیں بلکہ بنیاد اور درجے کا ہے۔ دار کی تعریف کی تین بنیادیں سامنے آتی ہیں: پہلی بنیاد قانون کا نفاذ ہے، یعنی کس علاقے میں کس کا قانون چلتا ہے؛ دوسری بنیاد امن ہے، یعنی مسلمان اور ذمی وہاں مامون ہیں یا نہیں؛ اور تیسری بنیاد سیاسی اقتدار ہے، یعنی حکومت و

عمل داری کس کے ہاتھ میں ہے۔ امام ابو حنیفہ نے قانون و امن دونوں کو جمع کر کے سخت شرائط لگائیں، صاحبین نے قانونی نفاذ کو کافی سمجھا، شافعیہ نے معاہداتی علاقے کو الگ درجہ دے کر تقسیم کو وسعت دی اور ابن تیمیہ نے مخلوط حقائق کو تسلیم کر کے اسے حالات سے جوڑ دیا۔ اس اختلاف کی اصل وجہ یہ ہے کہ نصوص میں دارین کی کوئی محدود تعریف موجود نہیں؛ یہ خالص اجتہادی مسئلہ ہے جس میں ہر فقیہ نے اپنے عہد کی سیاسی و قانونی حقیقت کو سامنے رکھا۔ یہی وجہ ہے کہ ایک ہی علاقے کے بارے میں مختلف ادوار میں مختلف آراء سامنے آتی رہیں۔ اس تجزیے سے یہ اصول برآمد ہوتا ہے کہ دار کا حکم کوئی مذہبی عقیدہ نہیں بلکہ ایک قانونی وصف ہے جو حالات بدلنے سے بدل سکتا ہے، اور اس کا اطلاق افراد کے جذبات سے نہیں بلکہ اہل علم و ریاستی اداروں کے غور و فکر سے ہونا چاہیے۔

عصر حاضر کی روشنی میں اس تقسیم کی معنویت

موجودہ دور میں دنیا کا نقشہ کلاسیکی عہد سے یکسر بدل چکا ہے۔ آج تقریباً تمام ریاستیں اقوام متحدہ کے چارٹر، باہمی معاہدات، سفارتی تعلقات اور بین الاقوامی قانون کے جال میں بندھی ہوئی ہیں؛ مسلمان اکثریتی ممالک بھی اور وہ ممالک بھی جہاں مسلمان اقلیت میں رہتے ہیں۔ جدید علماء کی بڑی اکثریت کی رائے یہ ہے کہ جن ممالک کے ساتھ صلح، معاہدات اور سفارتی تعلقات قائم ہوں وہ کلاسیکی اصطلاح میں دار العہد یا دار الامان کے دائرے میں آتے ہیں، اور معاہدوں کی پاسداری اسلام کا واضح حکم ہے، لہٰذا کسی ایسے ملک کو دار الحرب قرار دے کر وہاں کے امن، قانون یا معاہدوں کی خلاف ورزی شرعاً جائز نہیں۔ اسی طرح آج مسلمان جن ممالک میں شہریت، ویزے یا اقامت کے معاہدے کے تحت رہتے ہیں وہ اس معاہدے کے پابند ہیں اور وہاں کی جان و مال کی حفاظت ان پر لازم ہے۔ بعض معاصر علماء نے تجویز کیا ہے کہ جدید تناظر میں دار الشہادہ یا دار الدعوہ جیسی اصطلاحات زیادہ مناسب ہیں، کیونکہ آج مسلمان دنیا بھر میں امن کے ساتھ رہتے اور پرامن ذرائع سے اپنے دین کی نمائندگی کرتے ہیں۔ اس بدلتے تناظر کو تسلیم کرنا فقہ کی زندہ روایت کے عین مطابق ہے، کیونکہ خود فقہاء نے ان احکام کو حالات سے جوڑا تھا۔

نتیجہ

خلاصہ یہ ہے کہ دنیا کی دو داروں میں تقسیم فقہائے سیر کا اجتہادی قانونی نظام تھا جس کا مقصد ریاستوں کے باہمی تعلقات کو شریعت کے اصولوں کے تحت منظم کرنا تھا۔ امام ابو حنیفہ نے اس کے بدلنے کی تین سخت شرائط مقرر کیں، صاحبین نے احکام کے غلبے کو کافی سمجھا، امام شافعی نے دار العہد کو مستقل قسم قرار دیا اور امام ابن تیمیہ نے مخلوط حالتوں کے لیے دار مرکب کی صورت پیش کی۔ ان آراء کے تجزیے سے معلوم ہوتا ہے کہ اختلاف کی بنیاد قانون کا نفاذ، امن اور اقتدار جیسے عناصر کی ترتیب میں ہے، اور یہ ساری بحث عقیدے کا نہیں قانون و سیاست کے تجزیے کا مسئلہ ہے۔ عصر حاضر میں معاہدات اور بین الاقوامی نظام کی موجودگی میں علماء کی غالب رائے دنیا کو دار العہد و امن کے تناظر میں دیکھتی ہے اور معاہدوں کی وفاداری کو شرعی فریضہ قرار دیتی ہے۔ طالب علم کو چاہیے کہ ان آراء کو ان کے تاریخی سیاق اور مقاصد کے ساتھ سمجھے اور ان کے اطلاق کو اہل علم و ریاست کے دائرے میں رکھے۔

سوال نمبر 2: مسلم و غیر مسلم کا تصور اور اہل کتاب، اہل ذمہ، اہل صلح اور محاربین کا فرق (20 نمبر)

سوال نمبر 2: مسلم اور غیر مسلم کا کیا تصور ہے؟ نیز اہل کتاب اہل ذمہ، اہل صلح اور محاربین میں فرق واضح کریں۔ (20)

تعارف

بین الاقوامی اسلامی قانون کے احکام کا اطلاق انسانوں کی قانونی حیثیتوں پر ہوتا ہے، اس لیے اس علم کی بنیادی مباحث میں یہ سوال مرکزی اہمیت رکھتا ہے کہ مسلم اور غیر مسلم سے کیا مراد ہے اور غیر مسلموں کی مختلف قانونی قسمیں کون سی ہیں۔ فقہائے سیر نے غیر مسلموں کو ایک ہی درجے میں نہیں رکھا بلکہ اسلامی ریاست کے ساتھ ان کے تعلق کی نوعیت کی بنیاد پر انہیں مختلف قانونی درجوں میں تقسیم کیا۔ یہ تقسیم اس لیے اہم ہے کہ ہر درجے کے حقوق و فرائض، ان کی جان و مال کا تحفظ اور ان کے ساتھ برتاؤ کے احکام ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ ایک ہی غیر مسلم فرد اہل کتاب بھی ہو سکتا ہے، ذمی بھی اور حالات بدلنے سے اس کی حیثیت بھی بدل سکتی ہے۔ اس جواب میں پہلے مسلم اور

غیر مسلم کا شرعی تصور بیان کیا جائے گا، پھر اہل کتاب، اہل ذمہ، اہل صلح اور محاربین میں سے ہر ایک کی تعریف، بنیاد اور احکام الگ الگ بیان ہوں گے، اور آخر میں جدول اور تجزیے کے ذریعے ان چاروں کے فرق کو پوری طرح واضح کیا جائے گا تاکہ طالب علم کے ذہن میں یہ قانونی نقشہ مکمل صورت میں بیٹھ جائے۔

مسلم کا تصور

مسلم سے مراد وہ شخص ہے جو اللہ کی وحدانیت اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کا اقرار کرے اور دین اسلام کو قبول کر کے اس کے دائرے میں داخل ہو جائے۔ قانونی لحاظ سے اسلام کا ظاہری اقرار ہی دنیاوی احکام کی بنیاد بنتا ہے؛ جو شخص کلمہ شہادت کی گواہی دے اور اسلام کے قطعی و معلوم احکام کا انکار نہ کرے وہ مسلم شمار ہوتا ہے اور اس پر مسلمانوں کے حقوق و فرائض کا اطلاق ہوتا ہے، جبکہ اس کے باطن اور ایمان کی حقیقت کا فیصلہ اللہ کے سپرد ہے۔ دار الاسلام میں رہنے والا مسلم ریاست کا مکمل شہری ہوتا ہے: اس کی جان و مال محفوظ، اس کے دینی شعائر کی ادائیگی کا حق اسے حاصل اور دفاع و نظام ریاست میں اس کی ذمہ داریاں متعین ہوتی ہیں۔ جو مسلم کسی اور خطے میں رہتا ہو اس کی حیثیت کا تعین وہاں کے مقامی قانون اور اس کے اور اس ریاست کے درمیان تعلق سے ہوتا ہے۔ فقہاء نے مسلم کی اس حیثیت کو ایمان و عقیدے کی بنیاد پر قائم کیا ہے نہ کہ نسل، زبان یا خطے کی بنیاد پر؛ دنیا کے کسی بھی حصے کا باشندہ اسلام قبول کرے تو وہ اسی قانونی و دینی برادری کا فرد بن جاتا ہے۔ یہی عالمگیریت اسلام کے بین الاقوامی قانون کی نمایاں خصوصیت ہے۔

غیر مسلم کا تصور اور اس کی عمومی تقسیم

غیر مسلم سے مراد وہ شخص ہے جس نے اسلام قبول نہ کیا ہو۔ فقہی اصطلاح میں اس کے لیے عام لفظ کافر استعمال ہوتا ہے جو ایک اعتقادی وصف ہے، مگر قانونی احکام کے لیے فقہاء نے محض اس وصف پر اکتفا نہیں کیا بلکہ اسلامی ریاست کے ساتھ تعلق کی بنیاد پر غیر مسلموں کی درجہ بندی کی۔ اس درجہ بندی کا سب سے بڑا معیار امن اور معاہدہ ہے: جو غیر مسلم اسلامی ریاست کے ساتھ امن و معاہدے کی حالت میں ہو اس کی جان و مال شرعاً محفوظ قرار پاتا ہے، اور جو جارحیت و محاربہ کی حالت میں ہو اس کے ساتھ معاملے کے احکام مختلف ہوتے ہیں۔ اسی بنیاد پر غیر مسلموں کی مشہور قسمیں یہ ہیں: اہل کتاب جو عقیدے و کتاب کے اعتبار سے ایک خاص درجہ رکھتے ہیں؛ ذمی جو اسلامی ریاست کے

مستقل غیر مسلم شہری ہیں؛ مستأمن جو عارضی امن لے کر آئے؛ اہل صلح یا معاہد جو صلح کے معاہدے کے تحت اپنے علاقے میں رہتے ہیں؛ اور محارب جو جنگ کی حالت میں ہوں۔ یہ قسمیں اس بات کا ثبوت ہیں کہ اسلامی قانون انسان کو صرف مذہب کی بنیاد پر نہیں بلکہ اس کے رویے اور قانونی تعلق کی بنیاد پر بھی پرکھتا ہے، اور امن پسند غیر مسلم کے حقوق کو ہر صورت میں محفوظ رکھتا ہے۔

اہل کتاب: تعریف اور امتیازی احکام

اہل کتاب سے مراد وہ اقوام ہیں جن کے پاس اللہ کی نازل کردہ کتاب اور نبوت کی روایت موجود ہو۔ اس کا مصداق بنیادی طور پر یہود و نصاریٰ ہیں جن کی طرف تورات و انجیل نازل ہوئیں، اور جمہور فقہاء نے اسی دائرے کو اصل قرار دیا ہے۔ اہل کتاب کو اسلامی قانون میں خاص مقام اس لیے حاصل ہے کہ قرآن نے ان کے ساتھ نسبتاً قربت کا اظہار کیا ہے: ان کا ذبیحہ مسلمانوں کے لیے حلال قرار دیا گیا، ان کی پاک دامن خواتین سے نکاح کی اجازت دی گئی اور ان کے ساتھ کھانے پینے کے تبادلے کو جائز رکھا گیا۔ یہ احکام اس فکری و دینی نسبت پر قائم ہیں کہ اہل کتاب توحید، نبوت، وحی اور آخرت جیسے بنیادی تصورات کے اصل سلسلے سے جڑے ہیں، اگرچہ فقہاء کے نزدیک ان کے عقائد میں تحریف و اختلاف کی بحث اپنی جگہ موجود ہے۔ یہ بات سمجھنا ضروری ہے کہ اہل کتاب ایک اعتقادی و مذہبی درجہ ہے، قانونی شہریت کا درجہ نہیں؛ اہل کتاب میں سے کوئی فرد ذمی بھی ہو سکتا ہے، مستأمن بھی اور اہل صلح بھی، اور جو جارحیت میں ملوث ہو اس کے ساتھ اس کے عمل کی نسبت سے معاملہ ہو گا۔ اسی طرح فقہاء کے درمیان اس بحث میں اختلاف رہا ہے کہ مجوس اور دیگر قدیم مذاہب کے ماننے والوں کو اہل کتاب کے بعض احکام، خصوصاً جزیہ و ذمہ کے حوالے سے، شامل کیا جائے یا نہیں؛ حنفی فقہاء نے اس دائرے کو نسبتاً وسیع رکھا ہے۔

اہل ذمہ: تعریف، عقد ذمہ اور حقوق

ذمی ان غیر مسلموں کو کہتے ہیں جو اسلامی ریاست کے مستقل باشندے ہوں اور جنہوں نے ریاست کے ساتھ عقد ذمہ یعنی حفاظت کا معاہدہ کر رکھا ہو۔ لفظ ذمہ کے معنی عہد، ذمہ داری اور ضمانت کے ہیں؛ اس معاہدے کے تحت ریاست ان کی جان، مال، عزت اور مذہبی عبادت گاہوں کی حفاظت کی ذمہ داری لیتی ہے اور اس کے بدلے وہ ریاست کے

قانون کی پابندی اور استطاعت رکھنے والے بالغ مردوں پر عائد جزیہ کی ادائیگی قبول کرتے ہیں۔ ذمیوں کے حقوق فقہی کتابوں میں تفصیل سے مذکور ہیں: قتل وغارت سے تحفظ، املاک کی ملکیت و منتقلی کا حق، پیشے و تجارت کی آزادی، اپنی عبادت گاہوں میں عبادت کی اجازت اور اپنے مذہبی و عائلی معاملات میں اپنی شریعت کے مطابق فیصلے کی سہولت۔ تاریخی طور پر عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے عہد نامے اور دیگر خلفاء کے طرز عمل میں ذمیوں کے تحفظ پر سختی سے عمل کی مثالیں ملتی ہیں، اور فقہاء نے ذمی کو تکلیف پہنچانے کو سخت گناہ قرار دیا ہے۔ واضح رہے کہ عقد ذمہ ایک کلاسیکی قانونی ادارہ تھا جو اپنے دور کے شہریتی نظام کی صورت تھا؛ آج کی دنیا میں شہریت کا تصور آئینی برابری کی بنیاد پر قائم ہے اور مسلم ممالک کے غیر مسلم شہری اسی آئینی معاہدے کے تحت کئی حقوق رکھتے ہیں، چنانچہ کلاسیکی بحث کو تاریخی و علمی تناظر میں سمجھنا چاہیے۔

اہل صلح اور محاربین: تعریف اور فرق

اہل صلح، جنہیں اہل عہد یا معاہد بھی کہا جاتا ہے، وہ غیر مسلم ہیں جن کی ریاست یا علاقے نے اسلامی ریاست کے ساتھ صلح کا معاہدہ کر لیا ہو مگر وہ علاقہ دار الاسلام کا باقاعدہ حصہ نہ بنا ہو، یا وہ گروہ جن کے ساتھ عارضی یا مستقل موادعت یعنی عدم جارحیت کا معاہدہ ہو۔ اہل صلح اپنی زمین اور داخلی خود مختاری کے ساتھ رہتے ہیں، معاہدے کی مدت و شرائط دونوں فریقوں پر لازم ہوتی ہیں اور جب تک وہ معاہدے کی پابندی کریں ان کی جان و مال مکمل محفوظ رہتی ہے؛ صلح حدیبیہ اس کی سب سے مشہور تاریخی مثال ہے۔ اس کے مقابلے میں محاربین سے مراد وہ غیر مسلم ہیں جو مسلمانوں کے خلاف عملی جنگ و جارحیت کی حالت میں ہوں اور جن کے ساتھ کوئی معاہدہ یا امن موجود نہ ہو۔ لفظ محارب کا اطلاق ہر غیر مسلم پر نہیں ہوتا بلکہ صرف اس پر ہوتا ہے جو واقعتاً محاربہ یعنی جنگ میں شریک ہو؛ قدیم فقہاء نے بھی غیر عسکری آبادی، عورتوں، بچوں، بوڑھوں اور عبادت میں مشغول افراد کو ہر حال میں مامون قرار دیا۔ جدید بین الاقوامی قانون میں جنگجو اور غیر جنگجو کا یہی فرق انسانی قانون کی بنیاد ہے۔ طالب علم کے لیے یہ نکتہ بہت اہم ہے کہ محارب ہونا کوئی نسلی یا مذہبی درجہ نہیں بلکہ جنگ کی حالت کا عارضی وصف ہے جو صلح ہوتے ہی ختم ہو جاتا ہے۔

جدول 1: اہل کتاب، اہل ذمہ، اہل صلح اور محاربین کا فرق

جان و مال کا حکم	رہائش و تعلق	بنیاد	درجہ

ذبیحہ حلال، نکاح جائز؛ حفاظت تعلق کے درجے کے مطابق	کسی بھی درجے میں ہو سکتے ہیں	اعتقاد و آسمانی کتاب (یہود و نصاریٰ)	اہل کتاب
مکمل حفاظت؛ بدلے میں قانون کی پابندی و جزیہ	دار الاسلام کے مستقل باشندے	عقد ذمہ (مستقل شہریت کا کلاسیکی معاہدہ)	اہل ذمہ
معاہدہ برقرار رہنے تک مکمل حفاظت	اپنے علاقے میں خود مختار، معاہدے کے پابند	صلح / موادعت کا معاہدہ	اہل صلح
صرف جنگجوؤں سے متعلق احکام؛ غیر جنگجو ہر حال میں مامون	حالت جنگ میں موجود فریق	عملی جنگ و جدال کی حالت	محاربین

تجزیہ: فرق کی اصل بنیاد کیا ہے؟

ان چاروں اصطلاحات کے فرق کا تجزیہ کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ چاروں ایک ہی سطح کی تقسیم نہیں ہیں۔ اہل کتاب ایک مذہبی و اعتقادی وصف ہے جو کتاب و نبوت کی نسبت سے پیدا ہوتا ہے؛ اس کا تعلق عقیدے سے ہے، ریاست کے ساتھ معاہدے سے نہیں۔ اہل ذمہ اور اہل صلح دونوں قانونی و معاہداتی درجے ہیں مگر ان میں فرق رہائش اور شمولیت کا ہے: ذمی اسلامی ریاست کے اندر اس کا مستقل باشندہ ہوتا ہے جبکہ اہل صلح اپنے علاقے میں رہ کر بیرونی معاہدے سے جڑے ہوتے ہیں۔ محارب کا درجہ ان سب سے الگ ہے کیونکہ یہ کوئی مستقل حیثیت نہیں بلکہ جنگ کی کیفیت ہے۔ اس درجہ بندی سے اسلامی بین الاقوامی قانون کا ایک بڑا اصول سامنے آتا ہے کہ شریعت نے غیر مسلم انسان کو اس کے امن یا جارحیت کے رویے اور قانونی تعلق کی بنیاد پر دیکھا ہے، اور جس کے ساتھ بھی امن و عہد کا رشتہ قائم ہو جائے اس کی جان و مال کو اپنے شہریوں کی طرح

محفوظ قرار دیا ہے۔ قرآن کا یہ اصول کہ کسی قوم کی دشمنی بھی انسان کو عدل سے نہ ہٹائے، اور وفائے عہد کی مسلسل تاکید، اسی نظام کی روح ہے۔ اس لیے طالب علم کو ان اصطلاحات کو نفرت یا فوقیت کے مفاہیم میں نہیں بلکہ قانونی درجہ بندی کے علمی مفاہیم میں سمجھنا چاہیے۔

نتیجہ

خلاصہ یہ ہے کہ مسلم وہ ہے جو اسلام قبول کر کے دینی و قانونی برادری کا حصہ بن جائے، جبکہ غیر مسلموں کے درجات ان کے عقیدے اور اسلامی ریاست کے ساتھ تعلق کے اعتبار سے مختلف ہیں۔ اہل کتاب یہود و نصاریٰ ہیں جنہیں وحی کی نسبت کی بنا پر ذبیحہ اور نکاح جیسے امتیازی احکام حاصل ہیں۔ اہل ذمہ عقد ذمہ کے تحت اسلامی ریاست کے مستقل غیر مسلم باشندے تھے جن کی جان و مال و عبادت گاہیں ریاست کی ضمانت میں ہوتی تھیں۔ اہل صلح وہ ہیں جن سے صلح کا معاہدہ ہو اور وہ اپنے علاقے میں اس کے پابند رہیں، جبکہ محاربین سے مراد صرف وہ افراد ہیں جو واقعتاً جنگ و جارحیت کی حالت میں ہوں۔ امن کی ہر صورت میں غیر مسلم کی جان و مال کی حفاظت اسلامی قانون کا مسلم اصول ہے، اور ان درجوں کے اطلاق و تعین کا اختیار افراد کو نہیں بلکہ ریاست اور اہل علم کو حاصل ہے۔

سوال نمبر 3: بین الاقوامی معاہدات اور قواعد فقہیہ پر تفصیلی نوٹ (20 نمبر)

سوال نمبر 3: مندرجہ ذیل پر تفصیلی نوٹ لکھیں۔ 1۔ بین الاقوامی معاہدات 2۔ قواعد فقہیہ (20)

تعارف

اس سوال کے دو اجزاء ہیں اور دونوں بین الاقوامی اسلامی قانون کی بنیادیں ہیں۔ پہلا جز بین الاقوامی معاہدات کے بارے میں ہے، یعنی وہ عہد و پیمان جن کے ذریعے ریاستیں اپنے باہمی تعلقات کو قانونی شکل دیتی ہیں؛ اسلامی قانون نے وفائے عہد کو دینی فریضہ قرار دے کر معاہدات کو ایسی مضبوطی دی جو اس دور کے عالمی نظام میں کم ہی ملتی تھی۔ دوسرا جز قواعد فقہیہ کے بارے میں ہے، یعنی وہ کلی اصول جو فقہاء نے نصوص سے کشید کیے اور جن کی روشنی میں بے شمار جزئی مسائل کا حکم معلوم کیا جاتا ہے؛ یہ قواعد بین

الاقوامی قانون سمیت پوری فقہ کو نظم وضبط عطا کرتے ہیں۔اس جواب میں پہلے بین الاقوامی معاہدات کا مفہوم،اسلامی نقطہ نظر،اقسام،تاریخی مثالیں اور ان کو ختم کرنے کے اصول بیان کیے جائیں گے،پھر قواعد فقہیہ کی تعریف،تدوین کی تاریخ،پانچ بڑے قواعد اور بین الاقوامی قانون میں ان کے استعمال کی وضاحت ہو گی،اور آخر میں نتیجہ پیش کیا جائے گا۔طالب علم کو یاد رہے کہ یہ دونوں مباحث خلاصے کی نہیں بلکہ تفصیلی نوٹ کی صورت میں طلب کی گئی ہیں،اس لیے ہر جز کو مستقل عنوانات کے تحت مکمل بیان کیا گیا ہے۔

بین الاقوامی معاہدات: مفہوم اور شرعی بنیاد

بین الاقوامی معاہدے سے مراد دو یا دو سے زیادہ ریاستوں یا ان کے نمائندوں کے درمیان کیا گیا وہ ضابطہ عہد ہے جس کے تحت فریقین کچھ حقوق و فرائض قبول کرتے ہیں۔ اسلام میں معاہدے کی بنیاد وفائے عہد کا قرآنی اصول ہے۔قرآن مجید میں بار بار عہد پورا کرنے کا حکم دیا گیا،معاہدے کو اللہ کے نام کی ضمانت سے جوڑا گیا اور بدعہدی کو سخت ناپسندیدہ قرار دیا گیا۔ارشاد باری کا مفہوم ہے کہ جو عہد اللہ سے کیا جائے اسے پورا کرو اور قسموں کو پختہ کرنے کے بعد مت توڑو۔اسی طرح فرمایا گیا کہ مشرکین کے ساتھ کیے گئے معاہدات کو بھی ان کی مدت تک پورا کیا جائے جب تک وہ اپنے عہد پر قائم رہیں۔اس شرعی بنیاد کا نتیجہ یہ ہے کہ اسلامی ریاست کے لیے معاہدہ محض سیاسی مصلحت نہیں بلکہ دینی ذمہ داری ہے؛مسلمان حکمران یا سفیر جو معاہدہ کر لے وہ پوری ریاست پر لازم ہو جاتا ہے اور اس کی خلاف ورزی گناہ و جرم دونوں ہے۔فقیہ السیر امام محمد شیبانی نے معاہدات کی صحت،ان کے فریقین کی اہلیت اور ان کی شرائط پر مفصل مباحث قائم کیں جنہیں جدید بین الاقوامی قانون کے معاہداتی قانون کا پیش خیمہ سمجھا جاتا ہے۔جدید دور میں معاہدات کا قانون ویانا کنونشن 1969 میں مدون ہوا،مگر اسلامی وفائے عہد کا اصول صدیوں پہلے اسی جذبے کو دینی بنیاد دے چکا تھا۔

معاہدات کی اقسام اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی عملی مثالیں

فقہ السیر میں بین الاقوامی معاہدات کئی قسم کے بیان ہوئے ہیں: صلح و موادعت کے معاہدے جن میں جنگ بندی اور عدم جارحیت طے پاتی ہے؛ذمہ و امان کے معاہدے جن میں افراد یا گروہوں کو تحفظ دیا جاتا ہے؛تجارتی معاہدے جن میں تاجروں کی آمد و رفت اور امن طے ہوتا ہے؛اور اتحاد و تعاون کے معاہدے۔نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی

سیرت ان معاہدات کی زندہ مثالوں سے بھری ہوئی ہے۔ مدینہ آمد کے بعد آپ نے یہودی قبائل سمیت شہر کے تمام گروہوں کے ساتھ میثاق مدینہ طے کیا جسے بہت سے محققین دنیا کے اولین تحریری بین الجماعتی معاہدوں میں شمار کرتے ہیں؛ اس میں دفاع مشترک، اندرونی خود مختاری اور تنازعات کے حل کا نظام مقرر ہوا۔ صلح حدیبیہ میں آپ نے بظاہر سخت شرائط کو بھی امن کے وسیع تر مفاد کی خاطر قبول کیا اور پھر اس معاہدے کی اس درجہ پابندی کی کہ مخالف فریق کی خلاف ورزی سے پہلے مسلمانوں کی جانب سے کوئی انتقامی قدم نہیں اٹھایا گیا۔ نجران کے عیسائیوں کے ساتھ معاہدے میں ان کی جان، مال اور عبادت گاہوں کے تحفظ کی ضمانتیں دی گئیں جو صدیوں تک محفوظ رکھی گئیں۔ ان مثالوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی سفارت و قانون میں معاہدہ طاقت کا نہیں صداقت کا نام تھا، اور کمزور یا مضبوط ہونے کا فرق معاہدے کی پاسداری پر اثر انداز نہیں ہوتا تھا۔

معاہدے کی شرائط، مدت اور اختتام کے اصول

معاہدے کے درست و لازم ہونے کے لیے فقہاء نے کچھ شرائط بیان کی ہیں: معاہدہ کرنے والا مجاز حکمران یا اس کا باقاعدہ نمائندہ ہو، معاہدہ کسی قطعی شرعی حکم کے خلاف نہ ہو، اس میں دھوکا اور جبر نہ ہو اور اس کی شرائط واضح ہوں۔ صلح کے معاہدے کی مدت کے بارے میں فقہاء میں بحث ملتی ہے: حنفی و جمہور کے نزدیک ضرورت و مصلحت کی بنیاد پر طویل مدت بھی ممکن ہے، جبکہ بعض فقہاء نے حدیبیہ کی مدت کو سامنے رکھ کر دس سال کی حد زیر بحث رکھی؛ معاصر علماء کی رائے میں مستقل امن کے معاہدے بھی اسی اصول کے تحت آسکتے ہیں جب فریقین ان پر قائم رہیں۔ معاہدہ ختم ہونے کی صورتیں بھی متعین ہیں: مدت کا پورا ہو جانا، فریق ثانی کی صریح خلاف ورزی اور بدعہدی، یا باہمی رضامندی سے فسخ۔ اہم اصول یہ ہے کہ جب مسلمانوں کو دوسرے فریق کی بدعہدی کا اندیشہ ہو تو بھی پہلے معاہدے کو ختم کرنے کا اعلان کر کے برابری کی بنیاد پر آگاہ کرنا لازم ہے؛ خفیہ طور پر معاہدہ توڑ کر حملہ کرنا اسلام میں خیانت و غدر شمار ہوتا ہے جس کی سیرت و فقہ دونوں میں سخت مذمت ہے۔ اس اصول کو جدید قانون میں بھی معاہدات کے خاتمے کے اعلان و اطلاع کی صورت میں تسلیم کیا گیا ہے۔ اسی طرح معاہدے کی تشریح میں اصل فریقین کی مراد اور الفاظ کے عام مفہوم کو دیکھی جاتی ہے، اور شبہ کی صورت میں امن و عدم جارحیت کے پہلو کو ترجیح دی جاتی ہے کیونکہ اسلام میں اصل امن ہے، جنگ نہیں۔

قواعد فقہیہ: تعریف، ماخذ اور تدوین

قاعدہ فقہیہ اس کلی اصول کو کہتے ہیں جو شریعت کی بہت سی جزئیات پر منطبق ہو اور جس سے متعدد مسائل کا حکم معلوم ہو جائے۔ قواعد فقہیہ اور اصول فقہ میں فرق یہ ہے کہ اصول فقہ دلیل سے حکم نکالنے کا طریقہ سکھاتا ہے جبکہ قواعد فقہیہ خود احکام کی نوعیت و روح کو کلی جملوں میں بیان کرتے ہیں؛ اصول کا تعلق استدلال سے ہے اور قواعد کا تعلق احکام سے۔ یہ قواعد قرآن و سنت کے عمومی ارشادات اور فقہاء کے استقراء سے وجود میں آئے؛ مثلاً لا ضرر کی حدیث سے ضرر کی نفی کا قاعدہ بنا اور مشکلات میں آسانی کے قرآنی اصول سے مشقت و تنگی کے قواعد اخذ ہوئے۔ تدوین کے لحاظ سے ابو طاہر دبّاس اور ابو الحسن کرخی جیسے حنفی علماء کے مجموعے اس فن کی ابتدائی صورت سمجھے جاتے ہیں، پھر عزالدین بن عبد السلام کی قواعد الاحکام اور قرافی کی الفروق نے اسے وسعت دی، اور عثمانی دور میں مجلہ الاحکام العدلیہ کے آغاز میں ننانوے قواعد مدون ہوئے جن میں پہلے پانچ قواعد کو قواعد خمسہ یعنی بنیادی پانچ اصول کہا جاتا ہے۔ متاخرین نے ان قواعد پر منظوم و منثور شرحیں لکھیں اور آج یہ قواعد اسلامی قانون کی عملی روح سمجھے جاتے ہیں۔ اسلامی قانون کی طرح بین الاقوامی قانون میں بھی یہ قواعد راہنما اصولوں کی حیثیت رکھتے ہیں۔

پانچ بڑے قواعد فقہیہ کی تشریح

پہلا قاعدہ ہے: امور اپنے مقاصد کے تابع ہوتے ہیں؛ یعنی ہر عمل کا حکم اس کی نیت و مقصد پر مرتب ہوتا ہے، چنانچہ ایک ہی ظاہری عمل نیت کے اختلاف سے جائز یا ناجائز ہو سکتا ہے۔ دوسرا قاعدہ: یقین شک سے زائل نہیں ہوتا؛ یعنی ثابت شدہ حالت اس وقت تک برقرار رہتی ہے جب تک اس کے خلاف یقینی دلیل نہ آئے، یہ قاعدہ امان و معاہدات میں بھی کارفرما ہے کہ جس کو امن مل جائے وہ بدگمانی سے ختم نہیں ہوتا۔ تیسرا قاعدہ: مشقت آسانی کو لاتی ہے؛ یعنی جب کسی حکم میں غیر معمولی تنگی پیش آئے تو شریعت رخصت و تخفیف دیتی ہے۔ چوتھا قاعدہ: ضرر کو زائل کیا جائے گا؛ نہ خود ضرر اٹھایا جائے نہ دوسرے کو ضرر پہنچایا جائے، یہی قاعدہ غیر عسکری آبادی اور املاک کے تحفظ کی بھی بنیاد ہے۔ پانچواں قاعدہ: عادت و عرف محکم ہوتا ہے؛ یعنی جن معاملات میں نص خاموش ہو وہاں لوگوں کا مستند عرف فیصلہ کن حیثیت رکھتا ہے، اور بین الاقوامی

تعلقات میں رائج عرف ورسم، جنہیں آج رواجی بین الا قوامی قانون کہا جاتا ہے، اسی قاعدے سے فقہی توثیق پاتے ہیں۔ ان پانچوں کے تحت درجنوں ذیلی قواعد آتے ہیں، مثلاً ضرر کو اسی جیسے ضرر سے نہیں ٹالا جاتا، خاص ضرر عام ضرر کو روکنے کے لیے برداشت کیا جاتا ہے، اور درء المفاسد کو جلب المنافع پر مقدم رکھا جاتا ہے۔

جدول 1: قواعد خمسہ اور بین الا قوامی قانون میں ان کا اطلاق

بین الا قوامی اطلاق	مفہوم	قاعدہ
معاہدے کی تشریح میں فریقین کی اصل مراد و مقصد دیکھا جائے گا	عمل کا حکم اس کے مقصد کے تابع	الامور بمقاصدھا
قائم امن و معاہدہ محض شبہ والزام سے ختم نہیں ہو گا	یقین شک سے ختم نہیں ہوتا	الیقین لا یزول بالشک
حالات کی غیر معمولی تنگی میں فریقوں کو سہولت و مہلت کا اصول	مشقت آسانی لاتی ہے	المشقۃ تجلب التیسیر
غیر جنگجوؤں، املاک و ماحول کو نقصان سے بچانا لازم	ضرر کو دور کیا جائے گا	الضرر یزال
سفارتی آداب و رواجی بین الا قوامی قانون کی حجیت	عرف فیصلہ کن ہوتا ہے	العادۃ محکمۃ

بین الا قوامی قانون میں قواعد فقہیہ کی اہمیت و نتیجہ جز

قواعد فقہیہ کی اہمیت اس میں ہے کہ یہ منتشر جزئی احکام کو ایک فکری نظام میں باندھ دیتی ہیں۔ بین الا قوامی مباحث میں جب کوئی نیا مسئلہ پیش آئے، مثلاً فضائی حدود، بحری راستے، سائبر نزاعات یا عالمی تجارت کے نئے معاہدے، تو براہ راست نص کے نہ ہونے کے باوجود یہ قواعد رہنمائی دیتی ہیں: ضرر کی ممانعت ماحولیاتی نقصان کو روکتی ہے، عرف کی حجیت نئے عالمی رواج کی شرعی مطابقت کی راہ کھولتی ہے، اور یقین و شک کا قاعدہ سفارتی امان و حیثیتوں میں استقرار پیدا کرتا ہے۔ تاہم یہ وضاحت بھی ضروری ہے کہ قواعد

فقہیہ بذات خود مستقل دلیل نہیں ہوتے؛ یہ نصوص سے ماخوذ رہنما اصول ہیں اور جہاں صریح نص موجود ہو وہاں قاعدے کو اس پر مقدم نہیں کیا جا سکتا۔ معاہدات اور قواعد دونوں کا مشترکہ سبق یہ ہے کہ اسلامی بین الاقوامی قانون کی روح وفا، عدل اور ضرر کی روک تھام ہے۔ معاہدہ اس روح کا ادارہ جاتی اظہار ہے اور قواعد فقہیہ اس کی فکری بنیاد۔ جو طالب علم ان دونوں کو سمجھ لے وہ سیر کے جزئی مسائل کو بھی منظم انداز میں سمجھ سکتا ہے اور جدید مسائل پر بھی اصولی گفتگو کر سکتا ہے۔

سوال نمبر 4: بین الاقوامی اسلامی قانون کا دائرہ کار اور تنازعات کا حل (20 نمبر)

سوال نمبر 4: بین الاقوامی اسلامی قانون کے دائرہ کار اور تنازعات کے حل کو وضاحت کے ساتھ لکھیں۔ (20)

تعارف

بین الاقوامی اسلامی قانون یعنی فقہ السیر کا مطالعہ دو بڑے سوالوں سے شروع ہوتا ہے: اس قانون کا دائرہ کار کیا ہے، یعنی یہ کن فریقوں اور فریقوں کو گھیرے ہوئے ہے، اور اس نظام میں ریاستوں کے باہمی تنازعات کیسے حل ہوتے ہیں۔ یہ دونوں سوال اس لیے اہم ہیں کہ عام طور پر یہ تاثر دیا جاتا ہے کہ اسلامی تعلیمات میں بین الاقوامی قانون یا تو محدود ہے یا صرف جنگ کے احکام کا نام ہے، حالانکہ کلاسیکی فقہی ذخیرے کا جائزہ بتاتا ہے کہ اس کا دائرہ سفارت، معاہدات، تجارت، امن، انسانی حقوق اور تنازعات کے پرامن حل سمیت بہت وسیع ہے۔ اس جواب میں پہلے دائرہ کار کی تعریف و اجزاء بیان کیے جائیں گے، پھر تنازعات کی اقسام اور ان کے حل کے اسلامی طریقے یعنی مذاکرات، ثالثی، تحکیم اور عدالتی فیصلہ تفصیل سے زیر بحث آئیں گے، اور تاریخی مثالوں کے ساتھ یہ بھی واضح کیا جائے گا کہ اسلام میں تنازعے کے حل کی اصل ترتیب پرامن ذرائع سے شروع ہوتی ہے اور جنگ اس نظام کا مرکز نہیں بلکہ آخری و استثنائی صورت ہے۔

دائرہ کار: اشخاص، موضوعات اور مآخذ

دائرہ کار سے مراد کسی قانون کے وہ تمام اشخاص، علاقے اور موضوعات ہیں جن پر اس کا اطلاق ہوتا ہے۔ بین الاقوامی اسلامی قانون کے اشخاص میں سب سے پہلے اسلامی ریاست خود آتی ہے، پھر غیر مسلم ریاستیں اور ان کے حکمران، ان کے سفیر و ایلچی، تاجر، مسافر اور جنگی قیدی تک فرداً فرداً اس قانون کے مخاطب ہیں۔ موضوعاتی اعتبار سے اس کا دائرہ بہت پھیلا ہوا ہے: ریاستوں کا بیرونی اقتدار اور سرحدوں کی حفاظت، معاہدات کا انعقاد و نبھاؤ، سفارت اور سفیروں کے حقوق، امن و امان کے عہد، جنگ کی قانونی شرائط و آداب، جنگی قیدیوں اور زخمیوں کا تحفظ، مال غنیمت و فتح شدہ علاقوں کے احکام، بین الاقوامی تجارت و محصول، بحری و بری آمد و رفت کا امن، اور فتح و شکست کے بعد کی قانونی صورتیں۔ مآخذ کے لحاظ سے یہ قانون قرآن و سنت سے بنیادیں لیتا ہے، خلفائے راشدین کے فیصلوں اور معاہدات سے عملی نمونے لیتا ہے، فقہائے سیر خصوصاً امام محمد شیبانی کی السیر الکبیر جیسی تصانیف سے نظام پاتا ہے اور قوموں کے مستند عرف کو بھی جائز حد تک قبول کرتا ہے۔ اسی وسعت دائرے کی وجہ سے مغربی مؤرخین قانون نے بھی شیبانی کو بین الاقوامی قانون کے ابتدائی مدونین میں شمار کیا ہے۔

دائرہ کار کے اہم شعبے

دائرہ کار کے اہم شعبوں کو چار بڑے حصوں میں بانٹا جا سکتا ہے۔ پہلا شعبہ امن کا قانون ہے، جس میں صلح و معاہدات، سفارت کاری، سفیروں کا تحفظ اور پرامن بقائے باہمی کے اصول آتے ہیں؛ اصل حالت اسلام میں یہی ہے۔ دوسرا شعبہ جنگ کا قانون ہے جو جنگ کے جواز کی شرائط، جنگجو و غیر جنگجو کا فرق، ہتھیاروں و طریقوں کی حدود، قیدیوں و زخمیوں کے حقوق اور جنگ بندی کے احکام پر مشتمل ہے؛ اس شعبے کی روح جنگ کو محدود و منظم کرنا ہے نہ کہ اس کی ترغیب دینا۔ تیسرا شعبہ غیر جانبداری و عبور کا ہے، جس میں ثالث ریاستوں، گذرگاہوں، تجارتی راستوں اور مستأمنین کے مسائل آتے ہیں۔ چوتھا شعبہ انسانی و معاشی تعلقات کا ہے جس میں تاجروں کا تحفظ، مہاجرین و پناہ گزینوں کا امان، سود و جبر سے پاک لین دین اور بعد از جنگ آبادیوں کے حقوق شامل ہیں۔ یہ تقسیم ظاہر کرتی ہے کہ اسلامی بین الاقوامی قانون محض ریاستوں کے فوجی تعلقات کا قانون نہیں بلکہ انسانوں کے وقار اور امن عامہ کی حفاظت کا ایک جامع نظام ہے، اور اس کے بیشتر ابواب کا تعلق امن و تعاون سے ہے۔

تنازعات کی نوعیت اور اسلام کا بنیادی رویہ

ریاستوں کے درمیان تنازعات سرحدوں، دریاؤں و راستوں، تجارتی حقوق، معاہدوں کی تشریح اور شہریوں کو پہنچنے والے نقصان جیسے امور پر پیدا ہوتے ہیں۔ اسلام کا بنیادی رویہ یہ ہے کہ تنازعہ جنگ سے نہیں بلکہ بات چیت، عدل اور معاہدے سے حل ہو؛ قرآن نے دو گروہوں میں نزاع کی صورت میں صلح کرانے کا حکم دیا، باہمی مشورے کو مومنین کی صفت قرار دیا اور عدل کو تقویٰ کے قریب ترین بات کہا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی عملی سیرت میں بھی تنازعات کو مذاکرات و معاہدات سے حل کرنے کی سنت قائم کی؛ حدیبیہ میں امن کو عارضی شرائط سے برتر سمجھا گیا اور فتح مکہ کے موقع پر عام معافی کا اعلان کر کے انتقام کے چکر کو توڑا گیا۔ اس اصول کی وجہ یہ ہے کہ جنگ انسانی جان و مال کی ہلاکت کا نام ہے، اس لیے شریعت نے اسے صرف اس وقت جائز ٹھہرایا جب صلح کی جارحیت کو روکنے کا کوئی پرامن راستہ باقی نہ رہے اور اس کا فیصلہ و اعلان بھی ریاست کے باقاعدہ نظام کے تحت ہو۔ اس سے یہ بات پوری طرح واضح ہو جاتی ہے کہ اسلامی قانون میں تنازعات کے حل کی سیڑھی پرامن ذرائع سے شروع ہوتی ہے اور ہر اگلا قدم پچھلے قدم کی ناکامی پر اٹھایا جاتا ہے۔

تنازعات کے حل کے طریقے: مذاکرات، ثالثی اور تحکیم

پہلا طریقہ براہ راست مذاکرات ہے؛ فریقین کے حکمران یا ان کے سفیر باہم مل کر اختلاف کو گفت و شنید سے طے کرتے ہیں۔ سفارتی مذاکرات کی حفاظت کے لیے سفیروں کو ہر دور میں تحفظ دیا گیا اور ان کا قتل سختی سے ممنوع قرار پایا، کیونکہ سفیر محفوظ نہ ہو تو گفتگو کا راستہ ہی بند ہو جائے۔ دوسرا طریقہ ثالثی و مصالحت ہے، جس میں کوئی تیسرا فریق فریقین کو قریب لاتا اور صلح کی صورت تجویز کرتا ہے؛ خاندانی نزاعات میں حکم مقرر کرنے کی قرآنی ہدایت اسی اصول کی گھریلو صورت ہے اور ریاستوں کے درمیان بھی علماء نے اسے اسی بنیاد پر جائز و پسندیدہ رکھا۔ تیسرا طریقہ تحکیم ہے، جس میں فریقین باہمی رضامندی سے کسی شخص یا ادارے کو فیصل مقرر کر لیتے ہیں اور اس کے فیصلے کی پابندی قبول کرتے ہیں؛ تاریخ اسلام میں تحکیم کے واقعات اگرچہ سیاسی تنازعوں سے جڑے ہونے کی وجہ سے زیر بحث رہے، مگر بطور اصول تحکیم کی صحت و افادیت پر فقہاء کا اتفاق رہا

ہے کہ باہمی رضامندی سے مقرر فیصل کا احترام تنازعے کے حل کی کامیاب صورت ہے۔ ان تینوں طریقوں کی مشترکہ خصوصیات رضامندی، عدل اور معاہدے کی پاسداری ہیں، اور یہی خصوصیات آج کے سفارتی نظام میں بھی اچھی ثالثی اور ثالثی عدالتوں کی بنیاد ہیں۔

عدالتی حل، عالمی ادارے اور معاصر اطلاق

تنازعات کے حل کا چوتھا طریقہ عدالتی فیصلہ ہے، یعنی کسی قائم شدہ عدالت یا بین الاقوامی ٹریبونل کے سامنے مقدمہ پیش کرنا اور اس کا فیصلہ ماننا۔ کلاسیکی دور میں مستقل بین الاقوامی عدالتیں موجود نہ تھیں، مگر قاضی و حکم کے اصول اور معاہدات میں شرط فیصلہ کی روایت اسی سمت کی ابتدا تھی۔ آج بین الاقوامی عدالت انصاف، ثالثی ٹریبونل اور علاقائی ادارے اسی مقصد کے لیے قائم ہیں، اور مسلم ریاستیں بھی ان کے سامنے اپنے مقدمات پیش کرتی اور ان کے فیصلوں کی پابند ہوتی ہیں؛ یہ عمل وفائے عہد کے اسلامی اصول سے پوری طرح ہم آہنگ ہے۔ اقوام متحدہ کے چارٹر کی دفعات بھی تنازعات کا پرامن حل لازم قرار دیتی ہیں، جو اسلامی نقطہ نظر کے قریب ہے۔ معاصر علماء اس بات پر زور دیتے ہیں کہ مسلم ریاستوں کو اپنے باہمی تنازعات بھی انہی پرامن ذرائع سے حل کرنے چاہئیں، اور اسلامی تعاون تنظیم جیسے اداروں کو ثالثی و مفاہمت کے موثر نظام بنانے چاہئیں۔ ساتھ یہ تنبیہ بھی ضروری ہے کہ تنازعات کے حل کا اختیار ریاستوں اور مجاز اداروں کو ہے؛ افراد یا گروہ اپنے طور پر جنگ و تشدد کی راہ اختیار کریں تو وہ اسلامی قانون کے دائرہ کار کی خلاف ورزی کرتے ہیں، کیونکہ امن و جنگ کے فیصلے اجتماعی نظم کے امور ہیں۔

جدول 1: تنازعات کے حل کی ترتیب اسلامی قانون میں

مرحلہ	طریقہ	بنیاد / مثال
1	براہ راست مذاکرات و سفارت	سفیروں کا تبادلہ و تحفظ؛ حدیبیہ کے مذاکرات
2	ثالثی و مصالحت (تیسرے فریق کی کوشش)	صلح کرانے کا قرآنی حکم؛ حکم مقرر کرنے کا اصول
3	تحکیم (باہمی رضا سے مقرر فیصل)	فریقین کی رضامندی سے فیصلے کی پابندی

وفائے عہد؛ جدید عدالت انصاف کی پابندی	عدالتی فیصلہ / بین الاقوامی ادارے	4
جارحیت روکنے کے سوا کوئی چارہ نہ رہے تو؛ سخت شرائط وحدود کے ساتھ	دفاعی جنگ (ریاستی فیصلے سے)	آخری / استثنائی

نتیجہ

خلاصہ یہ ہے کہ بین الاقوامی اسلامی قانون کا دائرہ کار ریاستوں، افراد، معاہدات، سفارت، تجارت، امن و جنگ اور انسانی تحفظ کے تمام اہم شعبوں پر محیط ہے اور اس کی بنیاد قرآن و سنت، سیرت و عمل صحابہ اور فقہائے سیر کی تدوین پر قائم ہے۔ اس نظام میں تنازعات کے حل کی اصل اور پہلی راہ پر امن ذرائع ہیں: مذاکرات، ثالثی، تحکیم اور عدالتی فیصلہ، جن میں سے ہر طریقہ آج کے بین الاقوامی نظام میں بھی موجود و تسلیم شدہ ہے۔ جنگ اس قانون کا معمول نہیں بلکہ جارحیت کے مقابل آخری دفاعی صورت ہے جس کے لیے بھی ریاست کا باقاعدہ فیصلہ، اعلان اور سخت انسانی حدود لازم ہیں۔ طالب علم کو اس وسعت اور ترتیب کو ذہن میں رکھنا چاہیے تاکہ وہ اسلامی بین الاقوامی قانون کو اس کی اصل جامع صورت میں سمجھ سکے اور اسے کسی ایک جز تک محدود کرنے کی غلطی سے بچ سکے۔

سوال نمبر 5: اسلامی سفارت کاری کے زریں اصول (20 نمبر)

سوال نمبر 5: اسلامی سفارت کاری کے زریں اصول تفصیل کے ساتھ قلم بند کریں۔ (20)

تعارف

سفارت کاری ریاستوں کے باہمی تعلقات کو پر امن اور منظم رکھنے کا فن و نظام ہے، اور اسلامی تاریخ میں اس کی بنیاد خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت سے پڑتی ہے۔ مدینہ کی ریاست قائم ہوتے ہی آپ نے ارد گرد کے حکمرانوں کو خطوط روانہ کیے، وفود کا استقبال کیا، ایلچی بھیجے اور معاہدات طے کیے؛ اس طرح سفارت محض ایک درباری رسم

نہ رہی بلکہ ایک اصولی ادارہ بن گئی۔ فقہائے سیر نے ان عملی نمونوں کو مرتب کیا اور سفیر کے انتخاب، اس کے فرائض، اس کے تحفظ اور اس کی اخلاقی ذمہ داریوں پر مفصل ابواب لکھے۔ اس جواب میں اسلامی سفارت کاری کے زریں اصول ترتیب کے ساتھ بیان کیے جائیں گے: وفائے عہد و صداقت، سفیر کا امن و تحفظ، امن و عدل کو مقصد بنانا، نرمی و حکمت سے دعوت و گفتگو، معاہدوں کی پابندی، ریاستی اختیار و نظم، انسانی وقار کا احترام اور دھوکے و غدر کی ممانعت۔ ہر اصول کو سیرت و فقہ کی روشنی میں واضح کیا جائے گا تاکہ معلوم ہو کہ اسلامی سفارت کاری طاقت و مکر کی سیاست نہیں بلکہ اصول و اخلاق کی سفارت ہے۔

اصول اول تا سوم: وفائے عہد، صداقت اور سفیر کا تحفظ

اسلامی سفارت کاری کا پہلا زریں اصول وفائے عہد ہے۔ جو بات سفیر یا ریاست کی زبان سے معاہدے کی صورت میں نکل جائے وہ دین و قانون دونوں کے لحاظ سے لازم ہو جاتی ہے؛ بدعہدی کو نفاق کی علامتوں میں گنا گیا اور حکمرانوں کو اپنے معاہدات کی پابندی کا خصوصی پابند کیا گیا۔ دوسرا اصول صداقت و شفافیت ہے: اسلامی سفارت میں جھوٹے وعدے، دورخی بیانات اور فریب پر مبنی معاہدے کی کوئی گنجائش نہیں؛ سفیر کے لیے سچائی اس لیے بھی ضروری ہے کہ اس کی ساکھ ریاست کی ساکھ ہوتی ہے۔ تیسرا اصول سفیر کا امن و تحفظ ہے۔ سیرت میں کئی مواقع پر مخالف ترین ایلچی بھی دربار میں آیا تو اسے کچھ نہ کہا گیا؛ قاعدہ مشہور ہوا کہ ایلچی قتل نہیں کیے جاتے۔ فقہاء نے اسی سے مستأمن کا پورا نظام اخذ کیا جس میں دشمن ریاست کے سفیر کو بھی مکمل امان ملتا ہے، اس کی رہائش، سامان اور واپسی محفوظ رکھی جاتی ہے اور اس کی بے حرمتی کو ریاست کی بے حرمتی سمجھا جاتا ہے۔ جدید ویانا کنونشن میں سفارتی استثنیٰ کا جو نظام ہے، اس کی بنیادی روح اسی قدیم اصول سے ملتی ہے جسے اسلام نے چودہ صدیاں پہلے مذہبی قانون کی حیثیت دی تھی۔ یہ تینوں اصول مل کر سفارت کے لیے وہ اعتماد پیدا کرتے ہیں جس کے بغیر کوئی مذاکرات آگے بڑھ ہی نہیں سکتے۔

اصول چہارم تا ششم: امن مقصود، حکمت و نرمی اور عدل

چوتھا اصول یہ ہے کہ سفارت کا اصل مقصد امن و مفاہمت ہے۔ اسلامی سفارت جنگ کی تیاری کا پردہ نہیں بلکہ جنگ سے بچنے اور تعلقات کو معمول پر رکھنے کا ذریعہ ہے؛ صلح کی ہر معقول پیش کش کو قبول کرنے کی ترغیب دی گئی اور قرآن نے دشمن کے صلح کی طرف جھکاؤ پر اللہ پر بھروسا کر کے صلح اختیار کرنے کا حکم دیا۔ پانچواں اصول حکمت، نرمی

اور اچھے اسلوب کی گفتگو ہے۔ سفیر کو رعب و دھمکی کے بجائے علم، تحمل اور بحث کے بہترین انداز کا پابند کہا گیا؛ ابن خلدون سمیت مسلم مفکرین نے سفیر کی ذہانت، زبان دانی اور مزاج شناسی کو اس کی بنیادی اہلیتوں میں گنا ہے۔ چھٹا اصول عدل و مساوات ہے: اسلامی سفارت میں دوست و دشمن کی تقسیم عدل کو نہیں روک سکتی، وفود کے ساتھ مہمان نوازی اور درجے کی رعایت تمام فریقوں کے لیے یکساں رکھی جاتی ہے اور مذاکرات میں دوسرے فریق کے جائز مفاد کو تسلیم کرنا اصول پسندی کی علامت سمجھا جاتا ہے، کمزوری نہیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دربار میں نجران کا عیسائی وفد آیا تو ان کے اعزاز و عبادت کی رعایت، اور حبشہ کی طرف ہجرت کرنے والوں کے مقدمے میں نجاشی کے عدل پر اعتماد، انہی اصولوں کی روشن مثالیں ہیں۔ ان اصولوں کی موجودگی میں سفارت دھوکے کا کھیل نہیں رہتی بلکہ اعتماد سازی کا عمل بن جاتی ہے۔

اصول ہفتم تا نہم: ریاستی اختیار، انسانی وقار اور غدر کی ممانعت

ساتواں اصول ریاستی اختیار و نظم ہے: سفارت ریاست کا عمل ہے، افراد اپنی مرضی سے بین الاقوامی وعدے نہیں کر سکتے۔ سفیر حکمران کا نمائندہ ہوتا ہے، اسے باقاعدہ اجازت نامہ، ہدایات اور اپنی حد اختیار معلوم ہوتی ہے؛ جو معاہدہ غیر مجاز شخص کر لے وہ ریاست پر لازم نہیں ہوتا۔ اس اصول سے سفارت میں نظم پیدا ہوتا ہے اور ریاست داخلی انتشار سے محفوظ رہتی ہے۔ آٹھواں اصول انسانی وقار کا احترام ہے: سفارتی گفتگو میں نسلی و مذہبی تحقیر، حکمرانوں کی توہین اور قوموں کی تضحیک سے روکا گیا، کیونکہ تحقیر سے پیدا ہونے والی نفرت تنازعات کو جنم دیتی ہے؛ مذاکرات کی میز پر مخالف کی عزت نفس کا خیال رکھنا اسلامی ادب سفارت کا حصہ ہے۔ نواں اصول دھوکے و غدر کی ممانعت ہے: سفیر کو جاسوسی کے ان کاموں سے دور رکھا گیا جو اس کے امان کی خیانت ہوں، اور امان لے کر نقصان پہنچانا فقہ میں غدر کہلاتا ہے جو حرام ہے۔ اس اصول کی روشنی میں سفیر اپنے میزبان ملک کے قانون و امن کا بھی احترام کرتا ہے، کیونکہ اس کا استثنیٰ اسے میزبان کی داخلی سلامتی سے کھیلنے کا حق نہیں دیتا۔ یہ نو اصول باہم مل کر ایک ایسا سفارتی ضابطہ اخلاق بناتے ہیں جس میں مقصد امن ہے، ذریعہ صداقت ہے اور بنیاد عدل و وفا ہے۔

جدول 1: اسلامی سفارت کاری کے زریں اصول ایک نظر میں

اصول	مفہوم	عملی صورت

معاہدے کی خلاف ورزی گناہ و جرم؛ مدت تک نبھا	معاہدے کی ہر صورت پابندی	وفائے عہد
سفیر و ریاست کی ساکھ کا تحفظ	سچی گفتگو، دور خا پن نہیں	صداقت
سفارتی استثنیٰ؛ قتل و بے حرمتی ممنوع	ایلچی کی جان و سامان کا امان	سفیر کا تحفظ
صلح کی معقول پیش کش قبول کرنا	سفارت کا ہدف صلح و مفاہمت	امن مقصود
مخالف کے جائز مفاد کا اعتراف، تحقیر سے اجتناب	نرم و عادلانہ گفتگو	عدل و حکمت
غیر مجاز وعدے ریاست پر لازم نہیں	سفارت صرف مجاز نمائندے سے	ریاستی اختیار

سیرت کی عملی صورتیں اور جدید نظام سے مطابقت

ان اصولوں کی عملی صورت سیرت و تاریخ میں بار بار نظر آتی ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے شاہان روم و فارس، مصر اور نجاشی حبشہ کو باوقار خطوط بھیجے جن میں دعوت کے ساتھ حکمرانوں کی عزت و خطاب کا پورا احترام تھا؛ دحیہ کلبی، عمرو بن امیہ اور حاطب بن ابی بلتعہ جیسے صحابہ ایلچی بن کر گئے اور ان کی حفاظت کی ذمہ داری میزبانوں نے بھی نبھائی۔ خلفائے راشدین و بعد کے ادوار میں سفارتی وفود کا باقاعدہ تبادلہ ہونے لگا اور درباروں میں ترجمان، نویسندے و فود اور سفارتی تحائف کا نظام قائم ہوا۔ آج کا عالمی سفارتی نظام، جس میں مستقل سفارت خانے، سفارتی استثنیٰ، معاہدات کا اندراج اور مذاکرات کے آداب شامل ہیں، ان اصولوں سے گہری مشابہت رکھتا ہے؛ فرق صرف ادارہ جاتی وسعت کا ہے۔ مسلم ریاستوں کے لیے ان اصولوں کی پابندی دہری اہمیت رکھتی ہے: ایک طرف یہ بین الاقوامی قانون کی پاسداری ہے اور دوسری طرف اپنے دین کے حکم کی تعمیل۔ اسی طرح غیر مسلم دنیا کے سامنے اصول پسند سفارت ہی اسلام کے پرامن تصور کی سب سے مؤثر نمائندگی کرتی ہے۔

نتیجہ

نتیجہ یہ ہے کہ اسلامی سفارت کاری کے زریں اصول وفائے عہد، صداقت، سفیر کا تحفظ، امن کو مقصد بنانا، حکمت و نرمی، عدل و مساوات، ریاستی اختیار، انسانی وقار کا احترام اور غدر کی ممانعت ہیں۔ یہ اصول سیرت نبوی سے ماخوذ ہیں اور فقہائے سیر نے انہیں قانونی نظام کی صورت دی ہے۔ ان کی روح یہ ہے کہ ریاستیں طاقت اور فریب کے بجائے عہد، عدل اور اعتماد سے جڑیں؛ سفیر ریاست کا فخر بھی ہو اور اس کے اخلاق کا گواہ بھی۔ جدید سفارتی قانون کی بنیادی قدریں انہی اصولوں کے قریب ہیں، اس لیے طالب علم کے لیے یہ سمجھنا آسان ہو جاتا ہے کہ اسلامی سفارت کاری کوئی قدیم رسم نہیں بلکہ ایک زندہ و مکمل ضابطہ ہے جو آج کے سفارتی نظام کی اخلاقی بنیادوں کو مزید مضبوط کرتا ہے۔ ان اصولوں پر عمل ہی سے ریاستوں کے درمیان دیرپا امن اور باہمی احترام کی فضا پیدا ہوتی ہے۔